R. N. 2186/57. Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29
Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

جلد ۲۰ - شمارہ ۴۱	ایڈیٹر - آل احمد سرور	علی گڑھ - ۸ نومبر ۱۹۶۱ء

[illegible] دھولپوری

دیوان جانی بہاری لال راضی بھرتپوری

"دیوان جانی بہاری لال راضی" کے زیرِ عنوان جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی کا مضمون اخبار ہماری زبان ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء میں نظر نواز ہوا۔ جانی جی کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہوتے ورنہ سکسینہ صاحب بخوش اسلوبی اس کمی کو پورا کر سکتے تھے۔ کہ موصوف کو مسٹر ایم جعفر کے مضمون مطبوعہ "زمانہ" ستمبر ۱۹۱۲ء کے علاوہ اس مضمون میں "حسبِ حال" نام راضی کی کوئی نامعلوم تصنیف بھی دستیاب ہو گئی تھی جس میں مصنف نے بقول سکسینہ صاحب "اپنی سرگزشت بیان کی ہے" مگر باوجود اس کے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ صاحبِ مضمون نے حد درجہ اختصار سے کام لیا اور متعلقات حالاتِ راضی تشنہ رہ گئے۔

مضمون نگار صاحب نے ایم۔ جعفر صاحب کا جو خلاصہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راضی تئیس (۲۳) سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے رہے جب کہ خود مصنف کے بیان سے ان کا پندرہ سال کی عمر میں ملازم ہو جانا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح مندرجہ خلاصے سے ان کی ملازمت کے سلسلے میں بھی کوئی تاریخی نتیجہ مستنبط نہیں ہوتا اور پھر خدمات کے تقدم و تاخر میں بھی الٹ پھیر معلوم ہوتا ہے۔ تصانیف بھی مضمون میں تشنۂ تفصیل ہیں اور مندرجہ تاریخیں بھی صحیح نہیں۔

جانی جی کی متعدد اور فاضلانہ تصانیف کو دیکھ کر زیرِ ترتیب "راجستھان میں اُردو" تالیف کے پیشِ نظر راقم سطور کو راضی کے مفصل حالات معلوم کرنے کی جستجو ہوئی تھی۔ چنانچہ متعلقہ ادبی ریکارڈ کی ورق گردانی کی مگر مقصد پورا نہ ہو سکا۔ بالآخر گزیٹیر وغیرہ قسم کی کتابوں کی جانب رجوع ہوا۔ پس مذکورہ وسائل اور جانی جی کی تصانیف کے مطالعے سے جو واقفیت بہم پہنچی۔ اسی کو غنیمت جان کر محفوظ کر لیا جس کا خلاصہ سطورِ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے تاکہ اُردو داں [illegible] راضی سے متعارف و قریب تر ہو سکیں۔

دورانِ جستجو کئی بار میرا بھرتپور جانا بھی ہوا۔ استطلاعات فراہم کرنے کی وہاں بھی میں نے بھرپور سعی کی لیکن حتمی طور پر کچھ نہ معلوم ہو سکا سوائے اس کے کہ جانی جی کی عالیشان حویلی جمی جی کے مندر کے قریب واقع ہے جو اس وقت ان کے کسی عزیز کے قبضہ و تصرف میں ہے مگر وہ بسلسلۂ روزگار بھرتپور سے باہر رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میری ملاقات بھی باوجود اشتیاق کے ان سے نہ ہو سکی۔ مکان سے تھوڑے فاصلے پر دوسرے محلے میں ایک مختصر سی دھرم شالہ بھی نظر آئی جس پر "جانی بہاری لال" بخطِ اُردو کندہ ہے۔ باشندگانِ قرب و جوار سے اس کے متعلق دریافتِ حال کیا مگر وہ مکمل واقفیت بہم پہنچانے سے قاصر رہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ دھرم شالہ بھی ہنوز جانی جی کی یادگار ہے۔

۲۹ مئی ۱۸۸۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقعے پر راجپوتانے کے ایجنٹ مسٹر سی کے ولیم والٹر صاحب کو جانی جی نے بزبانِ انگریزی ایک قصیدہ پیش کیا تھا جو راقم سطور کے کتب خانے میں مطبوعہ محفوظ ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ؎

"Now I am of Seventy Three"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۸ء میں وہ تہتر سال کے تھے۔ اس حساب سے ان کا سالِ ولادت ۱۸۱۵ء متعین ہوتا ہے نہ کہ ۱۸۲۲ء جیسا کہ سکسینہ صاحب نے اپنے مضمون میں بتایا ہے۔

منقولہ بالا مصرعے سے اوپر والے بند میں وہ اپنی ملازمت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ؎

"Fifty and eight years I have served
And from each blame myself preserved,
As my Testimonials show
And all, who know me do well know."

یعنی بسال مذکور ان کی خدمات اٹھاون سال کی ہو چکی تھیں۔ گویا ملازمت کی ابتدا ۱۸۰۹ء میں ہوئی۔ جس کا تمام تر تعلق انگریزوں ہی سے رہا۔ کیونکہ مدت مدید تک بخوش اسلوبی خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش کردیے جانے کی درخواست بھی انھوں نے انگریزوں کے حکام اعلیٰ ہی کو پیش کی جو قصیدۂ زیر بحث کے آخری بند میں بطریق ذیل قلمبند ہے:

"Please accept this my last request
As good as better and as best
No more than this I do require
My health desires me to retire
To pass my life in solitude
With thankfulness and gratitude
May god the omnipotent be
As kind to you as you to me."

جس سے ظاہر طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دوران ملازمت وہ کبھی کسی رئیس کے ملازم بن کر نہیں رہے ورنہ درخواست سبکدوشی متعلقہ رئیس کو چھوڑ کر اے۔ جی۔ جی کو پیش نہ کرتے۔

جیسا کہ قصیدے میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ستتر سال کی عمر میں انکی جسمانی حالت تسلی بخش نہیں رہی تھی۔ کمزوری، اضمحلال، ثقل سماعت اور ضعف بصر کی شکایتیں لاحق ہو گئی تھیں۔ قصیدے کی زبان اگرچہ انگریزی ہے مگر خیالات اور تشبیہات و استعارات اس میں وہی استعمال کئے گئے ہیں جو اردو و فارسی میں متداول ہیں۔ مصنف نے خود اپنے طریق کار کو جدت سے تعبیر کیا ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزی لباس میں ہندوستانیت چھپتی نہیں مگر خوشی کے اس موقعے پر کہ جب ہر چیز پر مسرت چھائی ہوئی ہے۔

"آثار الشعرائے ہنود" میں منشی دیبی پرشاد بشاش نے لکھا ہے کہ جانی جی نے تعلیم سے فارغ ہو کر عرصہ تک سرکار انگریزی میں "نوکری" کی جس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی ملازمت کی ابتدا انگریزی فوج سے ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں معمولی ملازم کی حیثیت سے بھرتی ہوگئے ہوں اور پھر ذہانت و صلاحیت کے سہارے رفتہ رفتہ ترقی کر گئے ہوں۔ نیز فوج کے نو ولایت افسروں کو پڑھانے کے فرائض ان کے سپرد کردیے گئے ہوں کہ اس زمانے افسروں کو ایسے کارکنان کی شدید ضرورت تھی مگر بعید یہ بھی نہیں کہ ان کے ملازم رکھنے کا مقصد یہی رہا ہو۔

انگریز اپنے ہندوستانی معلموں کو "منشی" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ نیز فوجی انگریزوں کو دیسی علوم پڑھانے والے بھی اسی نام سے پکارے جایا کرتے تھے۔ تعلق چونکہ ان کا بھی فوجی بیڑے سے ہوتا تھا اس لئے قواعد پریڈ کی پابندیاں فوجی دوسرے ملازمین کی طرح ان کے لئے بھی ناگزیر تھیں نیز بغرض تکمیل فرائض چھاؤنیوں میں ان کو رہنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوران ملازمت واقعی کا جہاں جہاں مقیم رہنا بتایا جاتا ہے وہاں وہاں انگریزی فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ چنانچہ اعظم گڑھ اور بنارس بھی اسی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ فاضل مؤلف "تلامذۂ غالب" نے جہاں بسلسلۂ ملازمت ان کا قیام بتایا ہے۔

جانی جی کا ابتدائی عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد تھا۔ انگریز آہستہ آہستہ اپنا اقتدار بڑھا رہے تھے۔ افسر بالعموم نو ولایت ہوا کرتے تھے۔ واقعی نے اپنی محنت، استقلال اور غیر معمولی صلاحیتوں سے ان کو متاثر کرلیا۔ لہٰذا گوناگوں عزت و سرفرازی درجہ بدرجہ ان کو ملتی چلی گئی۔ درس و تدریس کے سلسلے میں ذمہ دار حکام وقت سے سابقہ پڑا جس سے یہ ان کی نظر میں وقیع تر ہوگئے۔ پہلے فوج سے ترقی پاکر نائب وکیل بھرت پور مقرر ہوئے جہاں ان کی خدمات اور بھی قابل قدر ثابت ہوئیں یہاں تک کہ انتظامی معاملات میں دخل دینے کا موقع ان کو مل گیا۔ دیوان بھی بنا دیے گئے اور پھر وہاں سے وکیل بھرت پور اور مہاراجہ اودے پور کے اتالیق مقرر کر دیے گئے۔ بالآخر "راؤ بہادر" کے معزز خطاب سے ان کو سرفرازی بخش دی گئی۔ یہ انکی گرانقدر خدمات ہی کا اثر تھا کہ افسران کو عمر رسیدہ ہو جانے کے باوجود سبکدوش کردینا نہیں چاہتے تھے۔

ریاست کچھ کے راجہ اس زمانہ میں راؤ دیسل جی تھے۔ ریاست میں دقیانوسی خیالات کا دور دورہ تھا۔ رئیس اپنی حدود سے باہر قدم نکالنا بھی دستور کے خلاف سمجھتے تھے۔ محنت کا جبریہ لیا جانا اور دختر کشی کی رسم بطور عام رائج تھی۔ انگریز ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ نیز ریاست میں اپنے اثر و اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے درپے تھے بلکہ ۱۸۱۹ء میں اس ریاست سے پہلا معاہدہ ہو بھی چکا تھا۔ پس جانی بہاری لال کو بحیثیت دیوان ریاست متعین کردیا گیا۔ وہ چونکہ علمی حیثیت سے بھی خصوصی مرتبے کے حامل تھے۔ درس و تدریس انکی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ اس لئے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق دیسل جی کے صاحبزادے پراگ مل جی کی تعلیم و تربیت کا مقصد بھی ان کے ذریعے بااحسن الوجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔

جانی جی جس زمانے میں کچھ کے عہدۂ دیوانی پر فائز تھے اسی زمانے میں انھوں نے اردو زبان میں ایک منظوم کتاب کی تدوین کی ہے۔ نام اس کا "تعریف زبان فارسی و انگریزی" ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہ مثنوی کی طرز پر بحر رمل سالم مثمن محذوف یا مقصور میں موزوں کی گئی ہے۔ تاریخی قطعے بھی اسی بحر میں ہیں۔ سائز ۲۰×۲۶ اور مطبع اعجاز محمدی آگرہ میں چھپی ہے۔ چھ سو چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ انگریزی زبان کی تعریف پر حاوی اسکے دوسرے حصے کے آخر میں "منشی امین محمد بھی حال دیوان راج بیکانیر المتخلص بہ صہبا" کا کہا ہوا تاریخ اتمام کا مظہر ایک قطعہ شامل ہے جسکے دوسرے شعر میں جانی جی کا دیوان کچھ ہونا ظاہر کیا گیا ہے شعر یہ ہے:

داد گر جانی بہاری لال جی دیوان کچھ
آنکہ ہمتا و نظیرش مادر گیتی نزاد

(باقی صـ۸ پر)

؎ سنہ ۱۸۶۰ء کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے مرزا غالب سے فرمائش کی کہ وہ ایک سکّہ (ایک طرف کندہ کرانے کے لئے شعر) کہہ دیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ ایک عرضداشت (فارسی زبان میں) ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجنے کے لئے تیار کردیں۔ مرزا صاحب نے ایک عرضداشت کا مسودہ تیار کردیا اور وہ سکے "فارسی میں" لکھ کر بیکانیر اپنی ایک تحریر کے ساتھ روانہ کئے۔ اس تحریر کی اصل مولانا اطہر ہاپوڑی کے پاس محفوظ ہے۔ (جائزۂ زبان اردو۔ ص ۲۲۲ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب انجمن مطبوعہ ۱۹۳۸ء)

آل احمد سرور

کتابیں جو زندہ ہیں

دیوان غالب

غالب نے زندگی کی تعریف اپنے ایک شعر میں کی ہے ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

ہر بار لوگوں کی نظر میں رہنا، انھیں دیکھنا اور اپنے آپ کو دکھانا، انھیں رو رو کر یاد آنا بھی زندگی کی پہچان ہے۔ صرف اسی معیار سے دیوان غالب ان کتابوں میں سرفہرست ہے جو زندہ ہیں۔ یہ ایسی کتاب نہیں جس کا احترام سب کریں، مگر پڑھی کم جائے، یہ ایسی بھی نہیں جس کے متعلق ایک فیصلہ ہو چکا ہو جس میں ترمیم و اضافے کی گنجائش نہ ہو، نہ یہ ایسی کتاب ہے جو زندگی کے ایک خاص دور پر یاد آئے اور پھر گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو جائے۔ جب سے دیوان غالب سامنے آیا ہے اس کی شرحیں برابر لکھی جا رہی ہیں۔ عاشق اس میں حسن کے سیکڑوں جلوے اور عشق کے ان گنت انداز دیکھتے ہیں، فلسفیوں کو اس کے اشاروں میں حکمت کی ایک داستان ملتی ہے، صوفی اس کے ذریعہ سے فنا اور بقا، ہستی و عدم کے رموز پہچانتے ہیں، محبانِ وطن کو اس میں تہذیب کے نقش و نگار اور شکست و ریخت کا ایک آئینہ ملتا ہے، انسان دوستوں کے لئے اس میں نفسیات کے سیکڑوں اسرار اور شخصیت کے سیکڑوں گوہرِ آبدار ہیں اور جدید ذہن کے لئے کشمکش و اضطراب، تصادم و تلاش کے عجیب غریب پہلو، آزاد خیالوں کے لئے شوخی کی کتنی ہی پھلجھڑیاں اور ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے والوں کے لئے یادوں کی کتنی ہی بزم آرائیاں۔ غرض غزل کے اشاروں میں زندگی کی داستان کے جتنے باب سما سکتے ہیں وہ سب اشعار کے اس چھوٹے سے دفتر میں آ گئے ہیں۔ دیوان غالب گویا زندگی کا [illegible] کہا جا سکتا ہے، ہاں اسے پڑھنے کے لئے زندگی اور عاشقی کے آداب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

تو اور آرائشِ خمِ کاکل ● میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

آرائشِ خمِ کاکل کو حسن کی ترجمانی کہہ لیجئے تو اندیشہ ہائے دور دراز غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ خمِ کاکل کی مصوری آسان ہے لیکن اندیشہ ہائے دور دراز کی پرچھائیوں کو الفاظ میں اسیر کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے جذبے کی گرمی کے علاوہ ذہن کی روشنی ضروری ہے۔ بڑی شاعری جذبے کے آتش فشاں کا لاوا ہی نہیں، اس کی خاک پر افکار کے پھولوں کی جنت بھی ہے۔ غالب کے یہاں یہ شعلہ و شبنم دونوں ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ وہی شاعری زندہ رہنے والی، یاد آنے والی اور دیر تک اور دور تک متاثر کرنے والی ہوتی ہے جس میں فکر اور جذبہ، عاشقی اور زندگی، خوابوں کی آئینہ سازی اور حقائق کی سنگباری، امیدوں کا نشہ اور ناکامیوں کی ترشی سب ملے ہوئے ہوں۔ غالب نے انسان کو جس عالم میں دیکھا تھا وہ عالم ہمیں آج بھی جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو وہ آج زیادہ حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ● وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ● عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ● ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ● میں ہوں اپنی شکست کی آواز

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کیا کیا خضر نے سکندر سے ● اب کسے رہنما کرے کوئی

اس افسردہ و ستم رسیدہ، اپنی تدبیر سے شرمندہ اور اپنی تقدیر سے خوش انسان میں کبھی کبھی یہ جرأت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حیات و کائنات پر آزادانہ اور بے باکانہ نظر ڈالتا ہے اور اپنے تخیل کے دام میں مہر و ماہ تک کو اسیر کر لیتا ہے۔ یہ دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے۔ برق سے شمعِ ماتم خانہ روشن کرتا ہے۔ خاک سے پوچھتا ہے کہ تو نے میرے گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے، خدا سے سوال کرتا ہے کہ فرشتوں کے نامۂ اعمال لکھتے وقت ہمارا بھی کوئی آدمی تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان ان دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے کبھی وہ مایوسی کے سمندر میں غوطے کھا جاتا ہے اور زندگی اسے ایک تاریک تنہائی لگتی ہے اور کبھی اس کے دل میں امید کی شمع روشن ہو جاتی ہے اور دنیا اسے جنت نگاہ فردوس گوش معلوم ہوتی ہے۔ صرف حزنیہ یا صرف طربیہ تصور یک رخا ہے خواہ اس کے پیچھے کتنی ہی گہری نظر کیوں نہ ہو۔ غالب کے دیوان میں ہمیں وہ دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے جو امید و ناامیدی، سرشاری و محرومی، عیش و افسردگی، نغمہ و نالہ دونوں سے عبارت ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ● آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد ● مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ● یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ● آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

زندگی کچھ مجبوریوں کا نام بھی ہے۔ جہاں بعض حقیقتوں کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ کوئی بت کافر مہربان ہو جبھی تو زیست کے کچھ اور ستم ہیں، ہاتھ کچھ بھی ہو۔ جان بھی عزیز ہوتی ہے۔ حسن کی رنگینیاں غالب کی مرہونِ منت بھی ہوتی ہیں۔ منصور کا نعرۂ شوق کم ظرفی بھی ہو سکتا ہے۔

بہار نہ آئے تو بہار کی یاد تو ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر کیفیت اور ہر جلوے کی صداقت دیکھ سکتے ہیں وہ محض عاشق ہی نہیں عارف بھی ہیں، وہ دیوتاؤں کے مٹی کے پاؤں، حسن کی مطلوبیت، بہار کی خزاں انجامی، آزردگی میں انداز جنوں، نالۂ غم میں ہنگامہ اور رونق، طاعت میں مے و انگبیں کی لاگ کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ذہن کو وسعت، تخیل کو جولانی اور طبیعت کو ہمہ گیری سکھاتے ہیں۔ وہ منتشر کرنوں سے سورج کا احساس کر لیتے۔ ہر حجاب کے پردے میں،

سادہ دیکھ لیتے ہیں۔ روزمرہ زندگی کے مظاہر، وحدت کثرت اور بے ربط چیزوں میں قانونِ قدرت اور نفسیاتِ انسانی کا گہرا رشتہ پا لیتے ہیں اس لئے ہم ان کے یہاں ایک حکیمانہ نظر، ایک فلسفیانہ گہرائی، ایک مسلسل بصیرت، سطحی رشتوں سے بلندی اور ایک وسیع وحدت سے وفاداری محسوس کرتے ہیں جو آج ہمیں دور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے ● مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ● ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب ● سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

اسی وسیع وحدت سے وفاداری، غالب کے یہاں انسانیت کے ایک اعلیٰ تصور کے ساتھ ایک ایسی شوخی بھی رکھتی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز سے لطف اٹھا سکتی ہے اور کبھی کبھی اپنے اوپر ہنس سکتی ہے۔ اس شوخی کی وجہ سے غالب خدا اور خدائی دونوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کچھ اور گوارا معلوم ہونے لگتی ہے۔ غالب کی شوخی سے زیادہ مستی طنز تھی، زاہد پر طنز، رقیب پر پھبتی اور دیر و حرم کی حد بندیوں سے کچھ آزادی کی کوشش۔ غالب کی شوخی میں ایک مہذب انسان کی نکتہ سنجی کے ساتھ سیاہی میں سفیدی، ظلمت میں نور، اور پرستش میں رنگا رنگی کار فرمائی دیکھنے کی جو کوشش ہے وہ بڑی پُر لطف ہے۔ غالب اپنے کو ذرا دور سے دیکھ کر بھی اپنی کمزوریوں پر ہنس سکتے ہیں اور اسی طرح شاعری کو زندگی کا ایک اور تیور دے دیتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
تاب لائے ہی بنے گی غالب ● واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل ● بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد ● آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دیوانِ غالب میں ہمیں ایک جلوۂ صد رنگ ملتا ہے۔ غالب زندگی کے ایک جلوے، حسن کی ایک ادا، عشق کے ایک انداز کے پجاری نہیں، وہ اس کے ہر رنگ اور ہر نقاب کے محرم ہیں۔ انھوں نے حسن کی ساحری اور حسرت کی فسوں گری کے بھی بڑے حسین نقش و نگار پیش کئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تمام سرد و گرم دیکھے تھے اور عشق کے دریچۂ خون سے بھی گزر رہے تھے۔ عاشقوں میں ان کا بڑا درجہ نہیں مگر خالص عشقیہ شاعری میں بھی وہ کسی سے کم نظر نہیں آتے۔ حسن کی مصوری دیکھئے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
تھی وہ اک شخص کے تصور سے ● اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

دیوانِ غالب اگرچہ انتخاب ہے مگر اس انتخاب کے سب اشعار یکساں بلند نہیں ہیں۔ اس میں ایسے اشعار بھی بہت سے ہیں جن میں صرف مضمون آفرینی اور نازک خیالی ہے مگر بے لطف اور بے مزہ اور کچھ دھول دھپے اور پھیرے کے اشعار بھی ہیں۔ شیکسپیر بھی اپنی گیلری کو ملحوظ رکھتا ہے اور غالب اپنے دور سے یکسر بے پروا نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر جیسا کہ حالی نے کہا ہے ان اشعار میں غالب نے زندگی کے جتنے جلوے جذب کر لئے ہیں اور ان جلوؤں میں جو آب و تاب آج بھی ہے اس کی تشریح ایک مختصر صحبت میں بہت مشکل ہے۔

غالب جانتے تھے کہ زندگی ایک سیدھا راستہ اور ایک سمت نما، ایک ولولہ، ایک عشق، ایک عبادت، ایک آنسو، ایک انگارہ نہیں ہے۔ انھوں نے اس بساط پر آنکھ کھولی تھی جو مغلوں کی تہذیبی گلکاریوں سے چمن بنی ہوئی تھی مگر ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہے کہ وہ اس بہار میں خزاں کی آمد دیکھ سکے اور ان کی آفاقیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آنے والی بہاروں کا تصور بھی کر سکے۔ ان کی گرمیِ نشاطِ تخیل نے انھیں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ بنایا۔ وہ اپنے دور میں خاصے مقبول تھے۔ گو انھوں نے ناقدری کا برابر رونا رویا ہے۔ مگر اس دور میں ان کی آزاد خیالی، ترقی پسندی، وسیع المشربی، رواداری، انسان دوستی، شوخی، نکتہ سنجی، حقیقت پسندی، صورت گری، بلاغت اور جامعیت انھیں اردو کے تمام شاعروں سے زیادہ دلکش اور دلنواز و رفیق بناتی ہے۔ یوں ان کے دیوان میں ہمیں قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، قطعے سب کچھ مل جاتے ہیں اور اسے "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" والا قطعہ تصویر کی عمومیت کے باوجود رنگوں کی شوخی کی وجہ سے بہت بڑا کارنامہ ہے مگر دراصل غالب نے غزل کو جو صرف حسن کی مدح تھی، تخیل کی کرشمہ سازی اور ذہن کی تازہ کاری کا ایک ایسا جوہری بم بنا دیا ہے کہ اس کا مسلسل ردعمل نئی ذہنی لہریں برابر پیدا کرتا رہتا ہے۔ بیسویں صدی کی پیچیدہ اور پُر آشوب دنیا کے ہر تجربے اور تحریک اس کی ہر بلندی اور پستی کا گویا غالب کو پہلے سے اندازہ تھا! دیکھئے فضا پیمائی پرواز کے لئے کیسا بلیغ اشارہ ہے ؎

نہ پوچھ وسعتِ مےخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

اور اس رنگا رنگ دنیا کے لئے اس سے بہتر دستور العمل بھی کیا ہو سکتا ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ● ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بےخودی ● رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات ● عارف ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

شفا گوالیاری

غزل

بغیر شیشہ و ساغر پلا دے بے جھجک ساقی
سلامت یہ لب لعلیں یہ سانسوں کی مہک ساقی
سبو چھلکا ذرا اشک و گل کی لہرائیں دھنک ساقی
ہے ہم دامن جھٹکتے ہیں تو زلفوں کو جھٹک ساقی
یہ کس کا عکس تھا اس میں یہ کس کے جام سے چھلکی
چمن سا کھل گیا جو میکدے سے چاند تک ساقی
یہ راہ زندگی ہے جانے کیسا وقت آجائے
ہماری بے خودی میں رکھ خودی کی بھی جھلک ساقی
یہ ممکن ہے ہمارے زخم خوردہ دل کی لغزش ہو
مگر کچھ ساغروں میں خون کی سی ہے جھلک ساقی
اُبھر آئے شعاع صبح ایک اک موج ساغر سے
ابھی دیکھی کہاں تو نے غم دل کی چمک ساقی
اُلٹ جاتے ہیں کتنے ہی ورق تاریخ عالم کے
ادائے خاص سے تیری جھپکتے ہی پلک ساقی
نہ کیونکر ناز ہو تیرے قد و گیسو کے سائے پر
بہاریں ہی بہاریں ہیں یہاں سے دار تک ساقی
مے نو ڈھالتا ہے یہ شفق سے ماہ و انجم سے
شفا کی شاعری میں زندگی کی ہے کھنک ساقی

صبا اکبرآبادی

غزل

الفت میں اتنے داغ ملے ہیں کہ کیا کہوں
ایسے حسین پھول کھلے ہیں کہ کیا کہوں
یوں ضبط غم سے ہونٹ سلے ہیں کہ کیا کہوں
خاموشیوں میں اتنے گلے ہیں کہ کیا کہوں
اُن کی ہر اک جفا کو نوازش سمجھ لیا
انعام وہ وفا کے ملے ہیں کہ کیا کہوں
مجھ سے زیادہ جیسے گریباں عزیز ہے
وہ وہ مرے جنوں کے گلے ہیں کہ کیا کہوں
دنیا سمٹ کے آگئی آغوش شوق میں
کچھ اس طرح گلے سے ملے ہیں کہ کیا کہوں
لگنے لگا ہے اب تو مجھے چارہ گر سے ڈر
پھاہوں سے اتنے زخم چھلے ہیں کہ کیا کہوں
آئی کسی کی بخشش گلچیں زخم دل صبا
یہ پھول اُس ہوا سے کھلے ہیں کہ کیا کہوں

نازش انصاری

تین شعر

روش عزم خرد تھی انھیں دیوانوں سے
عقل نازاں ہے جنھیں داخل زنداں کر کے
دل برباد سے پوچھے کوئی الفت کا مآل
کتنے غم پائے ہیں اک پیار کا ارماں کر کے
کم سے کم زیست ہی تھی اس سے عبارت اپنی
ہم پشیماں ہیں علاج غم پنہاں کر کے

شاہین غازی پوری

غزل

دنیا والو اپنی جھوٹی خواہش کی تسکین کرو
جتنا بھی جی چاہے میری چاہت کی توہین کرو
کب تک لیکن مغموم رہو گے دُکھ کے اوچھے وار سہو گے
لال گلابی سے چھلکا کر موسم کو رنگین کرو
دنیا کے غم کو اپنانا جی کو روگ لگانا ہے
زلفوں کے ٹھنڈے سائے میں اپنے کو بے دین کرو
دل کی آگ ہی بڑھ کر اک دن نار جہنم بنتی ہے
دل والو تسکین تمنا آؤ بصد تمکین کرو
چاند کی تابانی سے کیا ہے چاند تو اک ویرانہ ہے
کیوں چہرے کو دیکھ کے دل کا اندازہ شاہین کرو

درہ آفریدی

غزل

جیسی چاہو بنا دو مری زندگی
میرے غم کے لئے ہے تمہاری خوشی
بات میں نے جہاں مان لی آپ کی
مختصر ہو گئی ہے وہیں زندگی
اُس کو تپتی ہوئی دھوپ کی کیا خبر
جس کی تقدیر میں چھاؤں آئے گھنی
دل میں کیا اَن گنت میرے ارمان ہیں
جیسے راتوں میں ہو رات تاروں بھری
تیرے ہر اک ستم کو بھلا تو دیا
یاد باقی ہے لیکن تری آج بھی
ختم روداد یا ختم فکر و نظر
تیرے زانو پہ سر تھا کہ نیند آگئی

دھنی سیتاپوری

غزل

جس کو رونا تھا خون کے آنسو — بات کیا ہے وہ آنکھ نم بھی نہیں
یہ الگ بات وہ نہ ہوں محسوس — ورنہ غم زندگی کے کم بھی نہیں
میں سمجھتا ہوں تیری شانِ عطا — اب مجھے فکر بیش و کم بھی نہیں
میکدے سے نکل کے جاؤں کہاں — سامنے اب وہ حرم بھی نہیں
جانے کیا ہو گیا دھنی دل کو — یاد اب لذت الم بھی نہیں

علقمہ شبلی

غزل

زمیں ہے خاک پا نقش قدم ہے آسماں میرا
ہے مہر و ماہ و انجم سے بھی آگے کارواں میرا
وہ فصل گل ہے جس میں دشت و صحرا لہلہاتے ہیں
یہ فصل گل نہیں، جلتا ہے جس میں گلستاں میرا
نگاہ ناز کی ہے شرح میری اشک افشانی
کہانی آپ ہی کی ہے فقط طرز بیاں میرا
میں روح عالم امکاں، میں شمع عظمت یزداں
ازل ہے میری بیداری، ابد خواب گراں میرا
چلو صحرا کے ذروں کو شریک گفتگو کر لیں
چمن میں تو نہیں شبلی! کوئی بھی ہم زباں میرا

مراسلات

اُردو کے اہم مسائل

بزم اُردو ایس بی کالج گلبرگہ نے یہ طے کیا ہے کہ ماضی کی بہترین روایات کو قائم رکھتے ہوئے سال رواں میں نہ صرف تہذیبی جلسے کئے جائیں بلکہ سمپوزیم اور مقالوں کی روایات کو بھی مقبول بنایا جائے۔

ہماری آرزو ہے کہ مقالوں کا معیار قومی سطح کا ہو۔ ظاہر ہے یہ کام ناممکن ہوگا۔ اگر ہم اپنے ملک کے نامور ادیبوں اور دانشوروں کی شرکت کی توقع کریں عملاً یہ ان دانشوروں کے لئے ممکن ہے اور نہ ہمارے لئے۔ کیونکہ دور دراز سے ان مہمانوں کو بلانے کی ہم میں سکت نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ ملک کے سارے نمائندہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں ازراہ کرم اپنا قیمتی مقالہ، مضمون یا کم سے کم علم افروز پیغام عنایت فرمائیں۔ ہم پہلے انھیں اپنے سمپوزیم اور مقالات کے سالانہ جلسہ عام میں سنائیں گے اور اس کے بعد اپنے کالج میگزین میں بھی چھاپیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کی ذراسی نظر عنایت سے ہم ایک نئی جاندار اور مقصدی روایت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم طلبہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی زبان کے ارتقاء کا مسئلہ اسکے بولنے والے عوام کے تہذیبی اور سماجی ارتقاء کے مسئلے سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ مگر اردو زبان کے تعلق سے یہ بات بڑی انوکھی ہے کہ اردو زبان کے ترقی کے مسائل کچھ اور ہیں اور اردو بولنے والے عوام کے مسائل کچھ اور نظر آتے ہیں۔ اس تضاد کے اسباب کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔ یہ آج کا بنیادی مسئلہ بن گیا ہے جو نہ صرف اُردو زبان پر اثر انداز ہے بلکہ ہماری ساری تہذیبی ترقی کے لئے بھی رکاوٹ بن سکتا ہے۔

ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ نئی نسل کے لئے اور نئے تقاضوں کے لئے اپنا تھوڑا سا قیمتی وقت ہمیں دیجئے۔ اور ان مسائل پر اپنے قیمتی خیالات سے ہمیں اپنی اولین فرصت میں نوازیئے۔

اُردو زبان کے مسائل مختلف ریاستوں میں مختلف بھی ہیں اور مشترک بھی۔ مثلاً اتر پردیش اور بہار وغیرہ میں اُردو زبان کا مسئلہ حکومتی پالیسی کا مسئلہ ہے مگر مدھیہ پردیش مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور میسور وغیرہ میں یہ مسئلہ اور زیادہ گہرا ہے، کیونکہ ان ریاستوں کی علاقائی زبان اُردو سے مختلف ہے۔ مثلاً حکومت میسور نے یکم اگست ۱۹۷۱ء سے لازمی تعلیم کی اسکیم جاری کی ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں گاؤں میں لازمی تعلیم کا آغاز ہو رہا ہے مگر ہمارے ہاں شہروں کو چھوڑ کر ان اسکولوں میں کنڑا ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے اُردو کی پڑھائی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر اُردو زبان کی ترقی کے مسئلے کی، اُردو زبان بولنے والوں کی سماجی اور تہذیبی شعور سے ٹکر ہوتی ہے۔ اُردو زبان والے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مادری زبان میں ابتدائی جماعتوں سے ثانوی جماعت تک گاؤں گاؤں میں تعلیم کے لئے اُردو اسکول اور جماعتیں کھولی جائیں۔ اس کے برخلاف غیر جانبدار اور ہمدرد لوگ کہتے ہیں کہ اُردو ایک زائد زبان کی طرح اسکولوں میں پڑھانے کے مطالبہ سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے وغیرہ۔ مگر اس تعلق سے اُردو کے نمائندہ ادیب اور دانشور تقریباً خاموش ہیں۔ اس طرح قومی زندگی میں اُردو عوام کی علیحدگی پسندی دن بدن سماجی اور تہذیبی زندگی سے انھیں دور دھکیل رہی ہے جس کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ اور یہ نامی آخرکار اُردو کی ہی ہو رہی ہے۔

ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ براہ کرم حسب ذیل مسائل پر آپ بحیثیت ادیب یا افسانہ نگار یا شاعر یا نقاد یا دانشور یا صحافی (کسی بھی حیثیت سے) روشنی ڈالئے اور اپنا قیمتی مضمون، مقالہ یا کم از کم ایک معلومات آفریں پیغام ہی ہمیں روانہ فرما کر ممنون فرمایئے۔

مقالہ کا عنوان اور اس کے پہلو

(۱) اُردو زبان کے مسائل (بشمول تعلیم، رسم الخط، عروض، اور صحافتی مسائل کے)

(۲) اُردو زبان کے مسائل اور اُردو بولنے والے عوام کے مسائل میں تضاد کیوں ہے۔ اس کے اثرات کیا ہو سکتے ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔

(۳) اُردو زبان کی بنیادی بین الاقوامیت کو باقی رکھنے کے لئے اُردو اور دوسری زبانوں سے اشتراک رکھنے کے لئے کیا کیا جانا چاہیئے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنا قیمتی مقالہ مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۷۱ء تک ذیل کے پتہ پر روانہ فرما کر ہمیں ممنون فرمائیں گے۔

گلبرگہ۔ مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

پتہ: خواجہ معین الدین۔ معتمد بزم اُردو۔ ایس بی کالج گلبرگہ (میسور)

انجمن کا خبرنامہ

ایک اچھی خبر

ریاست میسور کی انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ گلبرگہ نے ریاست کے محکمۂ تعلیم سے درخواست کی تھی کہ ان طلبہ کے لئے جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے اور مدارس میں ایسے طلبہ کے لئے اردو پڑھانے کا معقول انتظام کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ محکمۂ تعلیم نے اپنی حق پسندی اور منصف مزاجی سے ان کی درخواست کو حق بجانب قرار دے کر عمل درآمد شروع کر دیا ہے اور انجمن کی شاخ کو درجے کھول دینے کی اطلاع دے دی ہے۔ چند خاص نام یہ ہیں :-

جی۔ سی۔ پرائمری اسکول موہن پورہ؛ جی۔ پی۔ اسکول چنچولی؛ جی۔ سی۔ پی اسکول کیم بھاوکا؛ جی۔ پی اسکول ہنسا گی؛ جی۔ ہل اسکول ضلع چیٹھہ؛ ہائی اسکول شاہ آباد؛ ہائی اسکول افضل پور؛ ہائی اسکول لکھیان؛ ہائی اسکول چنچولی؛

یادگارِ انیس کمیٹی لکھنؤ کی جانب سے قدر شناسانِ انیس کی خدمت میں

اپنے مشاہیر کی یادگار قائم کرنا زندہ قوموں کا شعار بلکہ قوموں کی زندگی کا ثبوت ہے۔ حامیانِ اردو کی یہ غفلت شعاری کس قدر افسوسناک ہے کہ اپنے بڑے سے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی یادگار قائم کرنے کا کیا ذکر ان کے مسکن و مدفن کا نشان تک باقی نہ رکھ سکے۔ غنیمت ہے کہ فردوسیِ ہند میر انیس کا مزار ان کی شاندار محل سرا اور دیوان خانہ خستہ و شکستہ حالت میں ابھی تک قائم ہیں، لیکن اگر کچھ دن اور اُن کی طرف سے غفلت برتی گئی تو اُنکے آثار بھی مٹ جائیں گے اور ہمارے دامن پر ایک بڑا بدنما دھبہ اور لگ جائیگا۔ اسی احساس کی تحریک سے یادگارِ انیس کمیٹی وجود میں آئی ہے، جس کے عہدہ دار حسب ذیل ہیں :-

صدر۔ سید علی ظہیر بیرسٹر ایٹ لا (سابق وزیر حکومت ہند و حکومت اتر پردیش)

نائبان صدر۔ (۱) پنڈت آنند نرائن ملا (جج الٰہ آباد ہائی کورٹ)

(۲) سید صدیق حسن آئی۔سی۔ایس (ریٹائرڈ ممبر بورڈ آف ریوینیو یو۔پی)

جنرل سکریٹری۔ سید علی عباس حسینی (سابق پرنسپل گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول حسین آباد، لکھنؤ)

مہتمم نشر و اشاعت۔ مرزا رضا حسین (سابق ڈپٹی کلکٹر و لے۔ ڈی۔ ایم ساگر، مدھیہ پردیش)

خازن۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب (سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی و اردو، لکھنؤ یونیورسٹی)

اس کمیٹی نے شاعرِ اعظم میر انیس کا مزار اُن کے شایانِ شان تعمیر کرنے اور ان کی محل سرا اور دیوان خانہ خرید کر اور ان کی مرمت کر کے اصل صورت میں ایک قومی یادگار کی حیثیت سے محفوظ رکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کم سے کم پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے جو قدر شناسانِ انیس کی تعداد کو دیکھتے ہوئے کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ اُن کی ادنیٰ توجہ سے یہ رقم بآسانی فراہم ہو سکتی ہے۔

انیس نے اردو شاعری کو "تنگنائے غزل" سے نکال کر بے پایاں وسعت بخشی۔ قدرت نے اُن کو تفکّر، تخیّل، مشاہدہ اور بیان کی جو عدیم المثال قوتیں عطا کی تھیں اُن سے کام لینے کے لئے انھوں نے واقعۂ کربلا کا سا عظیم موضوع منتخب کر کے رزمیہ، رثائیہ، بیانیہ اور اخلاقی شاعری کے میدانوں میں جو معجز نمائیاں کی ہیں، اُنھوں نے ہماری شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ سراسر صداقت پر مبنی ہے :

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر ۔ مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

یاد رکھئے کہ مزارِ انیس صرف انیس کی یادگار نہ ہوگا بلکہ خاندانِ انیس کے اُن تمام افراد کی یادگار ہوگا جو اپنی عمریں شاعری اور مرثیہ گوئی میں صرف کر کے اپنے بزرگ خاندان کے پہلو میں محوِ خواب ہیں یعنی انیس کے ایک بھائی مونس؛ تین بیٹے نفیس، رئیس، سلیس؛ تین پوتے عروج، جلیس، قدیم؛ ایک پرپوتے فائز؛ ایک نواسے مانوس اور ان کے دو بیٹے واصف اور واقف اور ایک بھانجے ذکی؛ نفیس کے نواسے عارف اور ان کے بیٹے فائق۔ وہ قطعۂ آراضی جس پر مزارِ انیس تعمیر کیا جا رہا ہے اس پر یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے۔

چھپے چھپے پہ ہیں یاں گوہر غلطاں تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مزارِ انیس کی تعمیر شروع ہو چکی ہے مگر اس کی تکمیل آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ خود دستِ کرم بڑھائیے، اپنے احباب سے مالی امداد دلوائیے اور جو ذرائع آپ کے امکان میں ہوں اُن سے کام لے کر مطلوبہ سرمایہ جلد فراہم کر دیجئے۔

رقوم عطیہ مندرجۂ ذیل پتے پر روانہ فرمایئے
پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب خازن یادگارِ انیس کمیٹی
ادبستان۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ
(سید علی عباس حسینی، جنرل سکریٹری یادگارِ انیس کمیٹی لکھنؤ)

علامہ سید علی اصغر بلگرامی کی یاد میں جلسۂ تعزیت

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے ملک کے ممتاز مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ سید علی اصغر بلگرامی کے سانحۂ ارتحال پر ۲۰ر اکتوبر شام کے ۵ بجے ایوان اردو میں ایک جلسۂ تعزیت پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر اکبر الدین صدیقی، قمر ساحری اور پروفیسر ہارون خاں شروانی نے ان کے علمی کارناموں اور خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور قرار داد تعزیت پیش کی گئی جسے حاضرین نے استادہ ہو کر منظور کیا۔ (وقار خلیل)

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا تعزیتی جلسہ

۳۰؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا جلسۂ تعزیت بسلسلۂ انتقال پنڈت سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، ہیرالال ورما ایڈوکیٹ صدر انجمن کی صدارت میں جناب مقبول احمد لاری صاحب کے مکان پر منعقد ہوا۔ جلسے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی جنرل سکریٹری انجمن، مولانا محمد یونس خالدی نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ حسب ذیل تجویز تعزیت پیش ہو کر پاس ہوئی۔

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا یہ جلسہ پنڈت سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کی موت پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ نرالا جی نہ صرف ہندی کے ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے بلکہ ہندوستانی ادب کے دورِ جدید میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ وہ ہندی کے علاوہ بنگلا، انگریزی اور سنسکرت سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کی مدد سے انھوں نے ہندی ادب کے دامن کو بہت وسیع کیا۔ ان کی شاعری نے صرف فن میں ہی نئی راہیں نہیں کھولیں بلکہ اپنے زبردست قومی جذبے کی عکاسی کر کے ہندوستان کی سیاسی بیداری اور سماجی اصلاح میں بھی زبردست حصہ لیا۔ یہ جلسہ نرالا جی کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ (سکریٹری)

ہری ہانس میں انجمن ترقی اردو کی نشست

ہری ہانس، ۲۰؍اکتوبر ۱۹۹۱ء ۱۰ بجے صبح گاندھی لائبریری کے ہال میں انجمن کی دوسری نشست ہوئی۔ جنرل سکریٹری نے میٹنگ کی روداد پیش کی جو باتفاق رائے منظور ہوئی۔ کمیٹی کی گذشتہ نشست کے مقابلے میں نئے ممبران کی تعداد میں قدرے اضافہ ہوا۔ اس حالیہ نشست میں انجمن کے ممبران نے مندرجہ ذیل باتوں پر خاص طور سے تبادلۂ خیال کیا۔

(۱) انجمن کی ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کیلئے معاشی امداد باہمی۔

(۲) انجمن کے ذریعہ عوام میں تہذیبی اور ادبی سرگرمی پیدا کرنے کی کوشش۔

(۳) انجمن کی ترقیاتی اسکیم کے تحت ایک ماہ میں دو ادبی مجالس منعقد ہوں گی جن میں محبانِ اُردو مختلف طریقوں (تحریری اور تقریری) سے اپنی استعداد علمی کا مظاہرہ کریں گے۔ کمیٹی کے اس پروگرام میں مشاعرہ، مباحثہ اور ادبی انعامی مقابلے کی تجویزیں کثرت آراء سے منظور ہوئیں۔ (سبحان احمد۔ ادیب، سکریٹری)

بزم ادب رانی پورہ اندور کی ادبی نشست

اندور۔ ۲۲؍اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ مقامی بزم ادب رانی پورہ اندور کی جانب سے ایک ادبی نشست کا انعقاد عمل میں آیا جسکی صدارت کے فرائض نوجوان شاعر ظفر احمد نظامی نے انجام دئے۔

نشست میں مقامی شعراء نے اپنا کلام سُنایا۔

(محمود نشتری۔ بزم ادب رانی پورہ)

تمل ناڈ اُردو مجلس ترچناپلی کا جلسۂ انتخاب

۲۲؍اکتوبر ۱۹۹۱ء بروز اتوار شام کے ۶ بجے زیر صدارت جناب ڈاکٹر ٹی امیرالدین احمد صاحب صدر مجلس، تمل ناڈ اُردو مجلس مرکزی کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں نئے سال کے لئے عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ مندرجۂ ذیل اصحاب منتخب ہوئے۔

صدر: ڈاکٹر ٹی امیرالدین احمد صاحب۔

نائبین صدر: جناب اسمٰعیل سید نصیرالدین احمد صاحب۔ جناب ڈی فضل الرحمٰن خاں صاحب۔ بیگم سعید صاحب۔

معتمد عمومی: جناب شہاب صاحب۔

نائبین معتمد: جناب سید حسین الدین صاحب۔ جناب ایم۔ اے رحیم صاحب۔ پنڈت چناتن صاحب۔

خازن: جناب ایچ محمد قاسم صاحب ایڈوکیٹ۔

ان عہدیداروں کے علاوہ تیس (۳۰) اصحاب پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی کی بھی تشکیل ہوئی جس میں مقامی اصحاب کے علاوہ مجلس کی مختلف شاخیں مدراس۔ کرور۔ تجاور اور سیلم کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا۔

اجلاس شب میں ٹھیک دس بجے معتمد عمومی کے اظہار تشکر پر اختتام کو پہنچا۔ (سید حسین الدین)

انجمن ترقی اُردو شاخ کامٹی کی ماہانہ ادبی نشست

۲۹؍اکتوبر کو انجمن ترقی اُردو کامٹی کی ماہانہ ادبی نشست زیر صدارت پنڈت گورداس رام صاحب سوز ہوشیارپوری، صدر انجمن بوقت دس بجے منعقد ہوئی۔ نشست کا افتتاح جناب ناظم انصاری کے مزاحیہ کلام سے ہوا۔ بعد ازاں حسب ذیل حضرات نے اپنی تخلیقات سے سامعین کو نوازا۔

عبدالرب عرفان، یونس افسر، پروفیسر قمرالتوحید صاحب جناب شاہد کبیر، عبدالرحمٰن راہی، وقار صدیقی، ڈاکٹر نذیر صاحب شمس کامٹوی صاحب، مولوی محمد سعید اعجاز صاحب، شاطر عکیبی صاحب، ناظم انصاری، حمید ناگپوری، پنڈت گورداس رام سوز صاحب؛ نشست بارہ بجے شب میں ختم ہوئی۔

(ظہیر انجمن سکریٹری)

ادبی سرکل احمد آباد

مورخہ ۲۹؍اکتوبر ادبی سرکل احمد آباد کی پندرہ روزہ نشست پروفیسر وارث حسین علوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ رحمت امروہوی نے اپنی نظم "نقادے" سنائی۔ سرشار بلند شہری نے نظم "ہیرا گھر" سنائی۔ جمیل کلیمی، بشیر احمد زخمی، اقبال فتحپوری نے غزلیں پیش کیں۔ تمام تخلیقات پر تنقید و تبصرہ ہوا۔ آخر میں پروفیسر وارث حسین علوی نے اپنا ڈرامہ مکان برائے فروخت سنایا جو کافی پسند کیا گیا۔ (عادل منصوری جوائنٹ سکریٹری)

اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس ۲۹ اکتوبر کو ۵ بجے شام اُردو ہال ذاتِ عمارت میں منعقد ہوا۔ ریڈر شعبۂ ہندی جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر راج کشور پانڈے نے اس جلسے کی صدارت کے لئے رائے جانکی پرشاد صدر اُردو مجلس نے استدعا کی۔ سب سے پہلے جناب مولوی نصیرالدین ہاشمی نے علامہ سید علی اصغر بلگرامی کی یاد میں ایک مضمون سنایا۔ ازاں بعد جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اُردو مجلس نے علامہ بلگرامی کے سانحۂ ارتحال پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ حاضرین نے استادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ اسے منظور کیا۔

اس کے بعد "کبیر داس کے دوہے" کے زیرِ عنوان نجم آفندی نے اپنا گراں قدر مقالہ سنایا اور کہا کہ "کبیر برج بھاشا کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں توحید کی تبلیغ، شرک کی مذمت، جھوٹے ویراگ کی مخالفت، سنتوش کی تعلیم، بھیک مانگنے کی برائی، حلم اور تواضع کا درس، سچائی کی خوبیاں، غیبت، بدگوئی اور عیب بینی کی مخالفت ملتی ہے۔ تصوف اور ایشور بھگتی کے جذبوں ہی سے کبیر کی شاعری کا خمیر اٹھا تھا۔" نجم نے کہا کہ کبیر لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے مگر اپنی شاعری کا وہ ایسا نقش چھوڑ گئے جو بہت پڑھے لکھے شاعروں کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ کبیر کے دوہوں میں ہلکے پھلکے اور عام فہم الفاظ ملتے ہیں۔ اسی سبب ان کے دوہے ہندی شعراء کے دوہوں سے مقبول ہوئے۔ نجم نے دوہوں سے کئی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ کبیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرقہ بندی کے سخت مخالف تھے ان کے کلام میں اخلاقی درس زیادہ ملتا ہے اور عاشقانہ رنگ بہت کم جھلکتا ہے۔

کبیر کی فارسی دانی کا ذکر کرتے ہوئے نجم آفندی نے بتایا کہ وہ فارسی زبان اور فارسی شعراء سے بے حد متاثر تھے۔ اسی سبب ان کے کلام میں کئی فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ کبیر داس کی سب سے بڑی خصوصیت جو انھیں دوسرے ہندی شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے غزل کی بنیاد رکھی، یہ اُردو کے سب سے پہلے غزل گو کہے جا سکتے ہیں۔ "بیجک دلی" میں ان کی ایک نظم جو بھجن کے نام سے شامل ہے تغزل کا پورا مزاج رکھتی ہے۔ خصوصاً یہ دو شعر ؎

ہمیں ہے عشق مستانہ ہمیں کو ہوشیاری کیا
رہے آزاد یا جگ سے ہمیں دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کے ناتے دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمیں سر بوجھ بھاری کیا

نجم کے اس پُر از معلومات مقالہ کے بعد محفل شعر و سخن میں بانو طاہرہ سعید، عزیز اقبال، وقار خلیل، صادق نقوی، ساجد رضوی، کیف رضوانی، مرزا عابد جاصم، عباس عابدی اور سراج صاحبان نے اپنا کلام پیش کیا۔ ملک کے ممتاز موسیقار جناب ایم۔ اے رؤف نے سازوں پر بھجن اور چند غزلیں سنائیں۔ آخر میں ڈاکٹر راج کشور پانڈے نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے اُردو مجلس کے ادبی جلسوں کو خراجِ تحسین ادا کیا اور کہا کہ "کبیر نے عوام کی زبان میں سیدھے سادے گیت کہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں زندگی کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پوجا یا عبادت سے کبیر نے لوگوں کو کبھی نہیں روکا۔ اگر انھوں نے کبھی مندر یا مسجد کے خلاف بھی لکھا ہے تو اس کا یہ مقصد تھا کہ لوگ پوجا یا عبادت کی اصل روح سے آشنا ہوں۔ کبیر نے آج سے سیکڑوں سال پہلے اس بات کا ڈنکا بجایا کہ یہ اعلان کیا کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہیں اور ہر شخص کو دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کی شاعری انکے درد دل کا نتیجہ ہے اسی لئے اس میں تاثیر ہے۔ ان کا پیغام پریم، محبت، صلح و آشتی اور بھائی چارہ کا تھا۔ (محمد منظور احمد معتمد اردو مجلس)

گجویل میں اُردو کی پانچویں جماعت کا قیام

حیدرآباد - ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

مسٹر جیم ریڈی صدر پنچایت سمتی گجویل نے مدرسہ نسواں گجویل میں اُردو ذریعۂ تعلیم کی پانچویں جماعت کو بحال کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ۲۰ر اکتوبر سے اس جماعت میں پھر سے تعلیم کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر چندر سری واستو معتمد انجمن تحفظ اُردو آندھرا پردیش نے گجویل پہنچ کر صدر پنچایت سمیتی اور مقامی اُردو بولنے والوں سے بات چیت کی۔ صدر سمیتی نے یقین دلایا کہ آئندہ سال اس مدرسہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کی چھٹی جماعت بھی قائم کی جائیگی۔ (سیاست)

انجمن ترقی اُردو ناندیڑ کی ماہانہ اُردو مجلس

انجمن ترقی اُردو کی ماہانہ اُردو مجالس جو پچھلے چار پانچ مہینوں سے بند ہو گئی تھیں، اب پھر ان مجالس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی اُردو مجلس بتاریخ ۲۹ر اکتوبر اتوار ۱۱ بجے صبح دارالمطالعہ ہال چوک میں منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب ابوالاظہر صہبا (صدر بزم شعر و ادب بودھن) نے کی۔ محمود عشقی جنرل سکریٹری نے انجمن کی رپورٹ سنائی اور انجمن کی سرگرمیوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا۔

م۔ خ۔ شاذلی نے اپنا افسانہ "جیون سنگیت" پڑھا۔ جس پر رفعت نواز، صہبا، فخر الزماں نے تنقیدی تبصرے کئے۔ رفعت نواز نے "جیون سنگیت" افسانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ایک فنکار کی نظر میں حسن کا جو حسین تصور ہوتا ہے وہ اس کے جمالیاتی شعور کی غمازی کرتا ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک عظیم موسیقار کے فن اور اسکے جمالیاتی تخیلات کے حسین امتزاج ملتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے مرکزی کردار سے انصاف کیا ہے۔

"رفعت نواز" نے ایک افسانہ "وہ کون تھا" پڑھا جس کا مرکزی خیال انگریزی کی کہانی سے لیا گیا تھا۔

ابوالاظہر صہبا نے رفعت نواز کے افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کہانی کا مرکزی خیال دوسری زبان کی کہانی سے لیا گیا ہے مگر افسانہ نگار نے بڑی خوبی سے اسکو ہمارے ماحول سے مطابق بنا دیا ہے جیسے وہ طبعزاد ہی لگتی ہے اور ایسی ہلکی پھلکی کہانیوں کی ہمیں قدر کرنی چاہئے۔ محمود عشقی نے اپنی نئی غزل سنائی۔ محمود عشقی کے بعد حبیب ثاقب، رشید الظفر، نجم سہر، تسنیم حیدرآبادی اور صدر مجلس ابوالاظہر صہبا نے اپنا کلام سنایا۔ جنرل سکریٹری کے شکریہ پر مجلس ۲ بجے ختم ہوئی۔

(محمود مجاز - معتمد نشر و اشاعت)

بقیہ

دیوان جانی بہاری لال راضیؔ بھرتپوری

صہبائی نے اسی قطعے میں بہ تعمیۂ "دل خوش" "فیض بخش عام بار" سے تاریخ بکرمی بہم پہنچائی ہے۔ مادہ ۱۹۱۰ کا حاصل ہے جس میں "دل خوش" یعنی دال کے چار عدد شامل کرنے پر سال بکرمی ۱۹۱۴ نکل آتا ہے، اور ستاون اس میں سے کم کر دینے پر ۱۸۵۷ سن عیسوی کے اعداد برآمد ہو جاتے ہیں، جو ہجری سال ۱۲۷۴ کے مطابق ہیں۔ یہ حصہ صفحہ ۲۴ سے شروع اور صفحہ ۲۳۰ پر ختم ہوتا ہے۔ شعر اس میں چار سو دو ہیں۔

پہلے حصے میں جو صفحہ ۱ سے صفحہ ۲۳ تک پھیلا ہے، فارسی تصانیف سے بحث کی گئی ہے یہ ۲۱۸ اشعار پر مشتمل ہے اس کے اختتام کی صوری و معنوی تاریخ خود مصنف نے کہی ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

لکھ کے اسکو فکر میں تاریخ کی تھا غوطہ زن • کستری جانی بہاری لال ناگر برہمن
ناگہاں ہاتف نے یہ مژدہ دیا از رشتۂ داد • گوش جاں اسکے حساب عیسوی سن کر کے یاد

لکھ بھی تاریخ اس کی بے بدل تو راضیا
ہے ربیع الثانی بارہ سو چہتر سال کا

۱۸ عیسوی ۵۷

فارسی و انگریزی دونوں حصوں میں گردانیں جدولوں میں درج کی گئی ہیں نیز انگریزی الفاظ کو بخط انگریزی اردو الفاظ کے نیچے لکھ دیا گیا ہے اور مثالوں میں استناد جونتی کے دربار شعراء سے کیا گیا ہے۔

فاضل مؤلف "تلامذۂ غالب" نے ۱۸۹۳ء میں مطبع دربار بھاونگر سے راضی کے دیوان کا شائع ہونا بتایا ہے جس سے زمانہ زیر بحث میں راضی کا مذکورہ علاقے میں موجود ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ بھرتپوری ایک شاعر کا مقامی اور پاس پڑوس کے مطبعوں کو چھوڑ کر وہاں اپنے دیوان کا چھپوانا جہاں صحت کے ساتھ اردو زبان کے بولنے والے بھی خال خال ہوں گے، قرین قیاس نہیں۔ اس عہد میں آگرہ طباعت کے کام کے لئے دور دور مشہور و مقبول تھا، دہلی اور بھوپال تک کی کتابیں آگرے میں چھپی ہیں۔ نیز راضی کی دوسری تصانیف پیش نظر بھی آگرے ہی کی مطبوعہ ہیں۔ کیونکہ کچھ سے فارغ ہونے کے بعد ان کا زمانہ بھرتپور یا اسی کے آس پاس کے علاقے میں گزرا ہے۔ پس بنظر صورت واقعات اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں کہ انکے دیوان کچھ رہنے کا زمانہ کم سے کم ۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۳ء تک یقیناً محیط رہا۔

گزیٹیر نیز یورپی مصنفین کی دیگر تالیفات میں ریاست کچھ کے مذکورۂ بالا عہد کو عہد زریں سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا تمام تر انحصار میرے خیال میں دیوان ریاست کی فہم و فراست، خوش انتظامی اور تدبر و دانائی پر ہونا یقینی ہے۔ یہ جانی جی کی ہم نشینی کا ہی اثر تھا کہ پراگ مل جی ولیعہد کچھ نے قدیم خیال کو خیرباد کہہ کر انگریزی تعلیم حاصل کی، نامناسب پابندیوں کو ترک کیا اور نمایاں اصلاحوں کے ذریعے اپنے علاقے کو فروغ دے کر تاریخی یادگار بنا لیا نیز غیر ملکی ارباب قلم تک سے خراج تحسین حاصل کرنے میں کامیاب و سرفراز ثابت ہوئے اور خطابات پائے۔

جانی جی کب تک دیوان کچھ رہے ریکارڈ پیش نظر سے بطور حتمی اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا نہ تحقیق کے ساتھ یہی معلوم ہوا کہ وہ کچھ کے بعد کہاں متعین کئے گئے۔ آثار و قرائن البتہ بتاتے ہیں کہ وہاں سے وہ بھرتپور آئے کہ پہلے یہیں نائب وکیل کے عہدے پر فائز تھے، جہاں کہ ۱۸۵۳ء میں بھرتپور نریش بلونت سنگھ جی کا دیہانت ہو گیا جن کو ۱۸۲۶ء میں انگریزوں نے گدی پر بٹھایا تھا[1]۔ اس وقت کے ان کے ولیعہد مہاراجہ جسونت سنگھ صرف تین سال کے خورد سال بچے تھے[2]۔ اس لئے ریاست کا انتظام پولیٹکل ایجنٹ اور سات سرداروں کی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا چنانچہ *Native chiefs & Their states* کے[3] صفحہ ۲۰ پر مرقوم ہے کہ:-

"During his minority The adminis-Tration was carried on by a political agent and council of Seven sirdars."

ادھر وکیل جی کے بعد جولائی ۱۸۶۰ء میں ان کے صاحبزادے پراگ مل جی راج گدی پر بٹھا دیے گئے۔ جانی جی سے یہاں جو کام لینا تھا کما حقہ اس کی تکمیل بھی ہو چکی۔ لہذا ان کو وہاں غیر ضروری سمجھ کر بھرتپور کے سات سرداروں میں شریک کر لیا گیا۔ چنانچہ ان کے نام کے ساتھ لفظ "پنچسردار" اسی زمانے کی یادگار ہے جو آج بھی ان کی جملہ تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس ترکیب میں "پنچ" تعداد کے معنی میں فارسی نہیں بلکہ ٹھیٹ اردو ہے جو بمعنی "عضو" استعمال کیا گیا ہے۔

"یادگار راضی" ان کی ایک تصنیف ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں چھپی ہے۔ اس میں مہتمم مطبع جو تقریظ شامل ہے اس میں "وکیل و پنچسردار" دونوں منضبط ہیں۔ پس اگر پنچسردار ہونا ان کی زندگی کے حصۂ آخر سے متعلق ہوتا جیسا کہ سکسینہ صاحب کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے، تو ۱۸۷۹ء کی مطبوعہ کتاب میں یہ درج نہ ہوتا۔ (باقی)

---

[1] ۱۸۲۶ء میں لارڈ کمبرمیئر نے بھرتپور فتح کیا لہذا یہ انتظامیہ معاملات میں انگریزوں کے ماتحت آگرہ کے صوبے سے متعلق ہو گیا چنانچہ خطبۂ ریاسی ۲۹ر نومبر ۱۸۵۸ء سے بھی اس کا آگرے کے صوبے میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔

[2] گزیٹیر جلد دوم صفحہ ۸۰ مطبوعہ ۱۸۸۰ء نیز نیٹو چیفس اینڈ دیئر اسٹیٹس صفحہ ۲۰۔

[3] مصنف G. R. Aberigh mackay پرنسپل ریزیڈنسی (راجکمار) کالج اندور مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۷ء سکنڈ ایڈیشن نیز حوالہ بالا صفحہ ۲۰۔

تبصرہ

وحید اختر

دیوان درد

مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی

درد اُردو کے اساتذۂ متقدمین میں اپنی شاعرانہ عظمت اور روحانی و علمی فضیلت کے لحاظ سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں، درد کی اس بزرگی کو تمام تذکرہ نگاروں نے بھی تسلیم کیا ہے اور اکثر ناقدوں نے بھی، اس کے باوجود اب تک درد کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق تھے، حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے درد کا دیوان بہت محنت اور اہتمام سے شائع کیا تھا، اب وہ دیوان بھی بازار میں نایاب ہے، درد کے دیوان کے جو نسخے عام طور پر بازار میں ملتے ہیں وہ اغلاط سے پُر ہیں اور نہایت بے توجہی کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی نے پہلی بار یہ کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر درد کے دیوان کے متن کی تصحیح کی جائے، اس سلسلے میں انھوں نے دیوان درد قلمی مکتوبہ ۱۲۳۶ھ ہجری (آزاد لائبریری۔ علی گڑھ)، دیوان درد قلمی مکتوبہ ۱۲۶۵ھ ہجری (آزاد لائبریری۔ علی گڑھ)، دیوان درد قلمی (انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ)، دیوان درد مطبوعہ مطبع محمدی لکھنؤ ۱۲۷۱ھ اور دیوان درد مطبوعہ مطبع نظامی بدایوں ۱۹۲۳ء سے مدد لی ہے۔ انھوں نے پہلے نسخے کو اس کی قدامت کی وجہ سے اس دیوان کی ترتیب کے لئے اساس بنایا، ہر صفحے پر حاشیے میں نسخوں کے اختلافات کی تشریح اور تصحیح کر دی گئی ہے، اس لحاظ سے درد کا یہ دیوان پچھلے دیوانوں کے مقابلے میں مکمل اور مستند کہا جا سکتا ہے۔ مرتب نے دیوان کی ترتیب میں جتنی محنت کی ہے، اتنی توجہ کتابت اور طباعت کی طرف نہیں کی گئی، اس لئے کہ کتابت اور طباعت اس قدر غلط اور ناقص ہے کہ مرتب کی محنت پوری طرح سامنے نہیں آ پاتی، اگر اس طرف بھی توجہ کی جاتی تو یہ دیوان نگاہ و اعتبار میں زیادہ وقعت حاصل کر سکتا تھا۔

ظہیر احمد صدیقی نے دیوان پر جو مقدمہ لکھا ہے اور جو کتاب کے تقریباً پچاس صفحات پر محیط ہے، بعض حیثیتوں سے غور طلب ہے، مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات یہ آ پڑی ہے کہ انھوں نے پہلے ہی صفحہ پر لکھا ہے:-

> "ان کی شاعری اور زندگی دونوں میں جمال اور پاکیزگی کا ایک لطیف احساس ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ صوفی شاعر کے علاوہ اور کچھ نہ بن سکے۔"

اس اقتباس میں دو باتیں محل نظر ہیں، پہلے جملے کا دوسرے جملے سے کوئی منطقی ربط نہیں، اس لئے کہ اگر کسی کی زندگی اور شاعری میں جمال و پاکیزگی کا لطیف احساس ہے تو یہ کیسے لازم آیا کہ وہ محض صوفی شاعر بن کر رہ جائے گا، دوسرے یہ بات خلاف واقعہ بھی ہے۔

درد کا احساس جمال ان کے تصوف کا تربیت یافتہ ضرور ہے مگر ان کی شاعری میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ محض صوفی نہ تھے بلکہ عاشق مزاج شاعر بھی تھے، ایسے اشعار کی ان کے یہاں کمی نہیں، دو چار مشہور شعر دیکھتے چلئے:-

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ● ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

جب نظر سے ہمارا گذر رہے ہے ● جی پہ رفتار یار گذرے ہے

یہی پیغام درد کا کہنا ● گر صبا کوئے یار میں گذرے
کون سی رات آن ملئے گا ● دن بہت انتظار میں گذرے

درد صوفی تو تھے ہی مگر وہ شاعر بھی تھے، مندرجہ بالا اشعار اس قبیل کے ہیں کہ انھیں لاکھ کھینچ تان کے بھی تصوف کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔

تصوف کا عنوان قائم کر کے اس موضوع پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ درد کے سلسلے میں یہ دیانتدارانہ کوشش کہی جا سکتی ہے کہ ان کے متصوفانہ نظریات کا سُراغ شاعری سے لگایا جائے، بعض ناقدوں کے اس اصرار کے باوجود کہ درد کی شاعرانہ عظمت ان کے تصوف کی وجہ سے نہیں اُن کی عاشقانہ شاعری کے باعث ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ درد کی اُردو شاعری سے بھی ان کے نظام تصوف کا کچا خاکہ تو مرتب کیا ہی جا سکتا ہے، مرتب نے بعض اہم مسائل تصوف کو درد کی شاعری کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اپنی جگہ یہ بات قابل تعریف ہے، مگر کئی مقامات پر ان سے لغزش بھی ہوئی ہے، لفظ تصوف کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے نکلسن کی تاریخ ادب عربی کو کافی سمجھا ہے۔ حالانکہ تصوف پر خود نکلسن کی دوسری کتابیں موجود ہیں جن سے مدد لی جا سکتی تھی، اسی لئے یہ بحث تشنہ اور ادھوری ہے، آگے چل کر انھوں نے "تصوف کے عقیدے کی بنیاد" اور "تصوف کیا ہے" جیسے اہم سوالات سے بحث کی ہے، اگر اس نقطۂ نظر کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تصوف اسلامی تعلیمات کا عطر ہے تب بھی اس بات کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ ان افکار و نظریات سے بحث کی جائے جنھوں نے تصوف میں غیر اسلامی تصورات کی آمیزش کی۔ پھر یہ سوال بجائے خود اہم ہے کہ ان بیرونی اثرات سے تصوف کا دامن کس حد تک وسیع ہوا اور کس حد تک ملوث ہوا، ان عنوانات کے ذیل میں ان مسائل سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ 'وحدت الوجود' اور 'وحدت الشہود' اسلامی تصوف کے دو زبردست مکاتب خیال ہیں جن کا اثر اسلامی فکر پر بہت گہرا پڑا ہے۔ چونکہ درد کا "طریق محمدی" ان دونوں اسکولوں سے انحراف بھی ہے اور ان کے بنیادی اصولوں کا تجزیہ بھی، اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ ان دونوں نظریات سے تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی اور اس بحث کی روشنی میں درد کے مسلک کو سمجھنے کی کوشش ہوتی، وحدت الوجود اور وحدت الشہود نے فارسی اور اُردو شاعری پر بھی ہمہ گیر اثرات چھوڑے ہیں، درد کو جب ہم صوفی شاعر کی حیثیت سے پڑھیں تو فطری طور پر یہ سوال

ہمارے سامنے آتا ہے کہ درد نے شاعری میں مروجہ نظریات تصوف کی روایت کو کس حد تک اپنایا اور اس میدان میں اپنے اجتہاد سے کتنا کام لیا۔ درد جب اس بات کے دعوے دار ہیں کہ انھوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے اختلافات و نزاعات سے قطع نظر کرکے خالص محمدی توجیہہ کی اشاعت کی تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان کے اس دعوے پر ان کی شاعری کس حد تک دلالت کرتی ہے، دیوان درد کے مقدمے میں ظہیر احمد صدیقی نے تصوف پر لکھتے ہوئے ان تمام مسائل کو نظرانداز کر دیا ہے، اس لئے یہ پوری بحث نامکمل و تشنہ معلوم ہوتی ہے، تصوف سے بحث کا یہ سلسلہ شاعری کے ذیل میں بھی ملتا ہے، اس لئے کہ انھوں نے درد کو محض صوفی شاعر ثابت کرنے کے لئے ان کی شاعری کو تصوف ہی کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے، وحدت الوجود کے عنوان سے جو اشعار دئے گئے ہیں ان میں سے کئی شعر دراصل ان کے نظریۂ وحدت الشہود کو ظاہر کرتے ہیں، اس التباس کا سبب یہ ہے کہ ان دو نظریات میں جو باریک سا فرق ہے اسے پوری طرح واضح نہیں کیا گیا۔

ایک عنوان قائم کیا گیا ہے "تمام ہیئات اُسی کے مظاہر ہیں" اس کے ذیل میں مرتب نے لکھا ہے کہ مادی اور عقل بھی خدا ہی کی صفات ہیں۔

"اگرچہ شریعت نے "فرقِ مراتب" پر نہایت زور دیا ہے
اور اس فرق کے نظرانداز کر دینے کو "زندیقی" ٹھہرایا ہے
لیکن درد (ظاہرِ شریعت کا احترام کرنے کے باوجود)
خیر و شر دونوں کا سرچشمہ ایک ہی سمجھتے ہیں۔"

اس فیصلے سے درد کی "متشرع شخصیت" مشکوک نظر آنے لگتی ہے، حالانکہ بات یوں نہیں، خیر و شر کا یہ مسئلہ اتنی آسانی سے نہ تو سمجھایا جا سکتا ہے نہ درد کو "زندیقوں" کی صف میں بٹھانا قرینِ انصاف ہے، وحدت الوجود کے نظریے سے محی الدین ابن عربی نے اپنے "نظریۂ خیر و شر" کا استنباط کیا ہے، درد بڑی حد تک اس کو قبول کرتے ہیں، بعض فروعات سے انھیں اختلاف ہے جس کا ثبوت علم الکتاب کے اس وارد کے مطالعہ سے ملتا ہے جس میں انھوں نے ابن عربی کے اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے ان پر بھی تنقید کی ہے اور شیخ قیصری کی اس تنقید سے بھی بحث کی ہے جو انھوں نے ابن عربی پر کی تھی، درد نے کہیں بھی شریعت کے اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ وہ ابن عربی اور حتیٰ کہ خود شیخ مجدد ایسے متشرع صوفی سے بھی کہیں زیادہ شریعت ظاہری کے احکام کا لحاظ کرتے ہیں، جب تک درد کے نظریۂ خیر و شر اور نظریۂ جبر و قدر کو پوری طرح نہ سمجھا جائے اس مسئلے پر کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا، اسی لئے ظہیر احمد صدیقی کا یہ فیصلہ محلِ نظر ہے کہ "درد خیر و شر دونوں کا سرچشمہ ایک ہی سمجھتے ہیں"۔ دراصل صوفیہ کے عقیدے کے مطابق خیر خدا کی ذات سے ہے اور شر صورت اضافی یا اعیان کی وجہ سے ہے، صوفیہ نے اس آیت کو اپنے اس نظریے کی بنیاد بتایا ہے۔

"وہ سب کچھ تم کو دیا ہے جس کو تمہارے عین نے
لسانِ استعداد سے مانگا۔"

ابن عربی نے اس آیت کی تفسیر کی ہے کہ خیر و شر کی استعداد اعیان کی اپنی ماہیت کے مطابق ہوتی ہے، اسی لئے ان کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ شے کو وہی عطا فرماتا ہے جو اس کے عین (یعنی معلوم) کا تقاضہ ہے"۔ یعنی انسانی تقدیر میں خود انسان کی رضا بھی شامل ہے۔ درد نے ارادہ، فعل، اختیار سے بحث کرتے ہوئے انسانی ارادے اور اختیار کو اضافی قرار دیا ہے، وہ امام جعفر صادقؓ کے اس اصول کو مانتے ہیں کہ "نہ جبر ہے نہ قدر بلکہ معاملہ دونوں کے درمیان ہے"۔

مرتب نے مسائلِ تصوف کی بحث میں اس محنت اور دقتِ نظر سے کام نہیں لیا، جس کی ضرورت تھی، اسی لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کے مرتبہ دیوانِ درد کا دوسرا ایڈیشن چھپے تو ان رایوں اور تنقیدوں پر نظرِ ثانی کی جائے تاکہ اس متن کی تصحیح میں جو محنت کی گئی ہے مقدمہ بھی اس کا ہم وزن ہو سکے اس طرح اس دیوان کی افادیت و اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔

درد کا یہ دیوان مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے دو روپے دس آنے میں مل سکتا ہے، یہ دیوان اپنے متن کے لحاظ سے یقیناً ان دواوین سے بہتر ہے جو عام طور پر بازار میں دستیاب ہوتے ہیں۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا